© rasailojaraid.com

مولانا محمد جعفر پھلواروی

فاضل مال کا انفاق

حضرت ابوسعید خدریؓ سے آنحضورؐ کی ایک حدیث یوں مروی ہے :

من کان معہ فضل ظہر فلیعد بہ علی من لا ظہر لہ۔ ومن کان لہ فضل زاد فلیعد بہ علی من لا زاد لہ۔ قال (ای ابوسعید الخدری) فذکر من اصناف المال ما ذکر حتی رأینا انہ لاحق لاحد منا فی فضل (محلی ج ۳، ص ۴۰۴)

جس کے پاس زیادہ سواری ہے وہ اسے دے دے جس کے پاس کوئی سواری نہیں ہے اور جس کے پاس فاضل زادِ راہ ہے وہ اسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہیں۔ راویؓ کہتا ہے کہ اس کے بعد حضورؐ نے متعدد اقسامِ مال کا اسی طرح ذکر فرمایا جس سے ہم لوگوں نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کے لیے کسی زائد از ضرورت چیز میں کوئی حق نہیں۔

یہ حدیث دراصل قل العفو کی مکمل تفسیر ہے۔ عفو کہتے ہیں زائد از ضرورت کو۔ قرآن میں ہے : یسئلونک ماذا ینفقون؟ قل العفو۔

"یعنی لوگ دریافت کرتے ہیں کہ کیا (کتنا) انفاق کریں؟ کہہ دیجیے کہ جتنا زائد از ضرورت ہو۔"

اسلامی نظامِ معاش کی آخری منزل یہی ہے۔ چالیسواں (سیم وزر میں) یا عشر (پیداوار میں) ایک ابتدائی قدم ہے۔ آخری منزل نہیں۔ آخری منزل انفاقِ عفو ہے اور یہ اصول دنیا کی ساری معاشی پیچیدگیوں کو اس طرح ختم کر دیتا ہے کہ مکمل معاشی ہمواری قائم ہو جاتی ہے اور کوئی کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ اسلامی نظامِ معاش ہرگز معاشرے کو محتاج و غنی کے دو طبقوں میں ہمیشہ کے لیے منقسم رکھنا نہیں چاہتا۔ وہ محتاجی کو ختم کرنا چاہتا ہے باقی رکھنا نہیں چاہتا۔ اس طبقاتی تفاوت کو ختم کرنے کا اور کوئی راستہ ہی نہیں بجز اس کے کہ جس کے پاس زائد از ضرورت ہے وہ اسے وہاں پہنچا دے جہاں ضرورت سے کم ہے :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حق مرا گفت کہ سر بر کف بنہ　　آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ
کس نباشد در جہاں محتاج کس　　نکتۂ شرعِ مبین این است و بس　(اقبال)

اسی لیے کسی طرح کا مال جمع کرنے کی مذمت بار بار قرآن میں آتی ہے جس کی تفصیلات میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ مال میں زمین بھی داخل ہے بلکہ پہلا نمبر اسی کا ہے۔ زیرِ بحث حدیث نبوی میں اگرچہ زمین کا ذکر نہیں لیکن من اصناف المال کے لفظ میں زمین سب سے پہلے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب سواری اور زادِ سفر و حضر کا زائد از ضرورت حصہ دے دینے کا حکم ہے تو فاضل زمین رکھ چھوڑنے کی اجازت کہاں سے ہو سکتی ہے۔ اگر زمین کے معاملے میں (جبکہ وہ ضرورت سے زائد ہو) قدرے تامل کی گنجائش نکل سکتی تھی تو حضورؐ کے دوسرے ارشادات نے اس گنجائش کو یکسر ختم کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ حدیث بخاری:

کان لرجال من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فضول ارضین فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: من کانت لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ فان ابی فلیمسک ارضہ[1]

بعض صحابہ کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں تو حضورؐ نے فرمایا کہ: جس کے پاس کوئی زمین موجود ہو وہ اسے خود کاشت کرے ورنہ اپنے کسی (مسلمان) بھائی کو دے دے۔ اگر وہ بھائی لینے سے انکار کرے تو اسے روکے رکھے (تا آنکہ کوئی لینے والا مل جائے)

اس ارشادِ نبویؐ میں چند نکتوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ صاحبِ زمین کو اپنے پاس اتنی ہی زمین رکھنی چاہیے جس کی کاشت وہ خود کر سکتا ہو۔ یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج کے دور میں ایک شخص ٹریکٹر اور ٹیوب ویل کے ذریعے مثلاً تین سو ایکڑ زمین کی کاشت خود کر سکتا ہے لہٰذا تین سو ایکڑ کی حد مقرر ہونی چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر وہ پانچ سو ایکڑ کی کاشت کر سکتا ہے تو شوق سے کرے لیکن اس کی پیداوار میں اس کا حق صرف اسی قدر

---

[1] بخاری کتاب الحرث وکتاب الھبہ۔ مسلم کتاب البیوع۔ ابوداؤد کتاب البیوع۔ ترمذی کتاب الاحکام۔ نسائی کتاب الایمان۔ ابن ماجہ کتاب الرھون بالفاظ مختلفہ والمعنی واحد۔ گویا صحاح و سنن اس حدیث پر متفق ہیں مسلم نے تو نو جگہ اس کا ذکر کیا ہے اور مسند احمد میں [illegible] ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوگا جو اس کے لیے کافی ہو۔ باقی ساری پیداوار اپنے پاس رکھنے کی بجائے دوسروں کو دے دینا ہوگا کیونکہ یہ بھی فاضل مال ہے۔ صحابہؓ نے ارشاد نبوی کا جو مطلب سمجھا اسے اسی روایت میں یوں ظاہر کیا گیا ہے کہ:

حتی رأینا انہ لا حق لاحد منا فی فضل۔

یہاں تک کہ ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کے لیے فضل (یعنی زائد از ضرورت) میں کوئی حق نہیں۔

دوسرا اہم نکتہ اس ارشاد نبویؐ میں یہ ہے کہ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ: جس فاضل زمین کی کوئی خود کاشت نہ کر سکتا ہو وہ کسی کے ہاتھ فروخت کر دے یا اسے بٹائی پہ دے دے بلکہ یہ فرمایا کہ لیمنحھا اخاہ۔ یعنی اپنے بھائی کو بطور عطیہ دے دے۔ منح کے معنی ہیں عطا کرنا۔ بلا معاوضہ دے دینا۔ نہ کہ فروخت کرنا[1]۔ رہی بٹائی تو آنحضرتؐ اسے کیسے گوارا فرما سکتے ہیں۔ جبکہ خود ہی بٹائی کو عین سودی کاروبار قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

من لم یذر المخابرۃ فلیأذن بحرب من اللہ ورسولہ[2]۔

جو بٹائی کو ترک نہیں کرتا وہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنے کو تیار ہو جائے۔

حضرت رافع بن خدیج نے بٹائی کا کاروبار کیا تو حضورؐ نے فرمایا:

اربیتما فرد الارض الی اھلھا وخذ نفقتک[3]

تم دونوں نے سودی کاروبار کیا۔ لہٰذا زمین واپس کر کے اپنا خرچ لے لو۔

ان روایات سے منح کا مطلب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ اگر کوئی شخص رضاکارانہ خوش دلی کے ساتھ اس حکم منح پر عمل نہ کرے تو کیا سربراہ ریاست اس پہ آرڈیننس کے ذریعے عمل کرا سکتا ہے یا نہیں؟ تو ہم اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اسے اس کا اختیار حاصل ہے۔

حضرت بلال[4] بن حارث مزنیؓ کو حضورؐ نے وادی عقیق کا ایک قطعۂ زمین بطور جاگیر عطا فرمایا تھا اور باقاعدہ پروانہ لکھ کر دیا تھا۔ جناب بلالؓ نے اسے آباد نہیں کیا۔ سیدنا امیر المومنین عمر فاروقؓ

---

[1] عاریۃً دینے کو بھی منح کہتے ہیں

[2] ابو داؤد کتاب البیوع حدیث نمبر ۳۴۰۶

[3] ایضاً حدیث نمبر ۳۴۰۲

[4] یہ مؤذن بلالؓ بن رباح حبشی نہیں بلکہ دوسرے بلال ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے ان سے وہ زمین واپس مانگی تو انھوں نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو خود آنحضورؐ نے مجھے لکھ کر عطا فرمائی ہے۔ امیر المومنین نے کہا کہ حضورؐ نے آباد کرنے کو زمین دی تھی۔ بے کار رکھ چھوڑنے کو نہیں دی تھی۔ لہٰذا تمھیں یہ زمین واپس کرنی پڑے گی۔[1]

سیدنا فاروقِ اعظم (صلوات اللہ علیہ) نے اس کی کوئی قیمت ادا نہیں فرمائی۔ قیمت ادا کرنے کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ ذرا غور فرمائیے۔ حضرت بلالؓ کوئی استحصال نہیں کر رہے تھے۔ زمین نہ انھوں نے خریدی تھی نہ کسی انگریزی حکومت نے وفاداری کے صلے میں دی تھی بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی اور پروانہ لکھ کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ حلال و پاکیزہ مال کوئی نہیں ہو سکتا۔ استحصال کا بھی کوئی اندیشہ نہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود چونکہ زمین کا مقصد پورا نہیں ہو رہا تھا۔ پیداوار سے محرومی مصالح عامہ کے خلاف تھی اس لیے امیر المومنین صلوات اللہ علیہ نے حضرت بلالؓ سے وہ زمین واپس لے لی اور بلا معاوضہ واپس لی۔ ایک تو اس لیے کہ وہ ان کی ضرورت سے زیادہ تھی۔ دوسرے اس لیے کہ نہ خود کام میں لاتے نہ دوسرے کو اس کا موقع دیا۔

سیدنا عمرؓ بن خطابؓ کے اس فیصلے کی روشنی میں آج بلا تامل یہی فیصلہ قانون کی شکل میں نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح کا فیصلہ محض حدِ جواز میں نہیں آتا بلکہ اس کا شمار آج کے واجبات میں ہے کیونکہ استحصال کا سب سے بڑا ذریعہ آج جاگیرداری ہی ہے۔ اب تو وہ لوگ بھی مجبور ہو کر زمین کو محدود کرنے پر راضی ہو گئے ہیں جو پہلے لامحدود ملکیتِ زمین کو عینِ اسلام قرار دے چکے ہیں۔

سیدنا عمرؓ کو زمین آباد کرنے سے جتنی دلچسپی تھی اس کا اندازہ آپ کے اس فرمان سے کیا جا سکتا ہے کہ:

من کانت له ارض ثم ترکها ثلث سنین فلم یعمرها وعمرها قوم اٰخرون فهم احق بها۔[2]

---

[1] کتاب الاموال۔ صفحہ ۲۹۰ حاشیہ ۷۲۸ لابی عبید القاسم بن سلام المولود ۱۵۴ھ المتوفی ۲۲۴ھ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس کے پاس کوئی زمین ہو اور وہ اسے تین سال تک بے کار رکھ چھوڑے اور آباد نہ کرے اور کچھ دوسرے لوگ اسے آباد کرلیں تو وہی اس کے زیادہ حقدار ہوں گے۔

یعنی یہ فقط اس صورت میں ہے جبکہ کوئی زمین کو بے کار رکھ چھوڑے۔ خود سوچیے کہ محض بے کار رکھنے کا "جرم" زیادہ ہے یا ضرورت سے زیادہ کثیر مقدار میں زمین رکھ کر بٹائی جیسا سودی کاروبار کرنا، خود کاشت کرنے کی بجائے دوسروں سے کاشت کرا کے ان محنت کشوں کے خون پسینے کی کمائی کو مفت کھانا پھر ان بے بسوں کو غلام بنائے رکھنا، ان کی آبرو کو لوٹنا، ان سے بے گار لینا، ان سے نذرانے وصول کرنا، ان کو جان بوجھ کر جاہل رکھنا، زندگی کی تمام آسائشوں سے محروم رکھ کر خود دادِ عیش دینا، ان مجبوروں کے ووٹوں سے خود انتخاب جیتنا اور ان میں سے کسی کو آگے بڑھنے کا موقع نہ دینا اور انھیں ہر طرح کے استحصال کا ہدف بنائے رکھنا؟ — اگر سیدنا فاروق اعظم صلوات اللہ علیہ کے دور میں محض آباد نہ کرنے کی معمولی سی غلطی پر زمین کا حقدار دوسرے آباد کرنے والے ہو جاتے ہیں اور ایسا ہونا جائز و مباح ہے تو آج کے دور میں جبکہ زائد ضرورت زمین ہزار فتنوں اور بدترین استحصال کا ذریعہ ہے۔ زمین کو بلامعاوضہ لے کر آبادکاروں میں تقسیم کر دینا صرف مباح ہی نہیں بلکہ واجبات میں داخل ہے اور "انفاقِ عفو" پر عمل کرانے کی تکمیل ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں انفاقِ عفو کوئی حکم نہیں صرف ترغیب ہے لیکن فاضل زمین لے کر قیمت ادا کرنے کی تو کہیں ترغیب بھی نہیں۔ جن غریبوں کو زمین دی جائے گی وہ قیمت ادا کرنے کے قابل ہی کب ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ ان حضرات کی نظر میں صاحبِ زمین جتنی زیادہ سے زیادہ قیمت چاہے طلب کر سکتا ہے اس پر کوئی شرعی پابندی نہیں۔ گویا ہزار روپے میں لی ہوئی زمین کا اگر وہ ایک لاکھ مانگے تو یہ گراں فروشی کوئی استحصال نہیں بلکہ عین اسلام ہے۔ سبحان اللہ و بحمدہ۔

سیدنا ابوبکر صدیق صلوات اللہ علیہ نے اپنے عہدِ خلافت میں تمام لوگوں کے وظائف یکساں رکھے تھے۔ سیدنا عمر فاروق سلام اللہ علیہ نے یہ رائے دی کہ اہلِ فضل اور سابقون فی الاسلام کو ان کی خدمات کے صلے میں زیادہ وظیفہ ملنا چاہیے۔ اس کا جواب سیدنا صدیق اکبر نے دیا وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمیشہ کے لیے اور ہر عادلانہ ریاست کے لیے شمع ہدایت اور اسوۂ حسنہ کا کام دیتا رہے گا۔
آپ نے فرمایا:

واما ما ذکرتم من السوابق والقدم والفضل فما اعرفنی بذلک وانما ذلک لشیءٍ ثوابہ علی اللہ جل ثناؤہ۔ وھٰذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ۔[1]

تم لوگوں نے تقدم وسبقت الی الاسلام کا اور فضل وشرف کا جو ذکر کیا ہے اس سے مَیں اچھی طرح واقف ہوں۔ لیکن یہ تو ایک چیز ہے جس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ اور یہاں تو معاش کا معاملہ ہے۔ پس اس میں یکسانی ترجیح سے بہتر ہے۔

صدیق اکبرؓ کے اس قولِ صادق میں اسلامی نظام کی پوری روح سمٹ کر آگئی ہے۔ اس کی تشریح کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ خلافتِ اولیٰ کے بعد جب فاروق اعظمؓ نے زمام خلافت سنبھالی تو وظائف میں تفاوت پیدا فرما دیا۔ آپ اس میں یقیناً نیک نیت تھے۔ نیک نیتی کی دلیل یہ ہے کہ آخری ایام میں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فرمایا:

لئن عشت الی ھٰذہ اللیلۃ من قابل لالحقن اخر الناس باولھم حتی یکونوا بیاناً واحداً[2]

اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو (فہرستِ وظائف کے) آخری طبقہ کو اوّل سے ملا دوں گا تاکہ سارے لوگ وظائف میں برابر ہو جائیں۔

یہی نہیں بلکہ سیدنا عمرؓ کا ایک ارشاد اور بھی سنیے۔ فرمایا:

لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فاضل اموال الاغنیاء فقسمتھا علی فقراء المھاجرین[3]

میں جو کچھ آج کرنا چاہتا ہوں اسے کاش پہلے ہی سمجھ لیا ہوتا تو امیروں کے فاضل (زائد از ضرورت) ...

---

[1] کتاب الخراج ص ۴۲ [2] کتاب الاموال ص ۲۶۴

[3] محلّٰی الجزء الخامس ص ۱۵۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مال لے لیتا اور مہاجر غریبوں میں تقسیم کر دیتا ۔

ذرا ملاحظہ فرمایئے ! یہاں مال کا ذکر نہیں ۔ اموال کا ذکر ہے ۔ جس میں روپے پیسے ، مکان زمین ، مویشی ، کھیت ، باغ ، سواری وغیرہ سب ہی کچھ آجاتا ہے ۔ انفاق صرف روپے پیسے کا نہیں ہوتا ۔ ہر نعمت کا ہوتا ہے ۔ قرآن نے انفاق کے اس عموم کو باقی رکھا ہے ۔ وانفقوا مما رزقنٰکم ہم نے تمھیں جو جو کچھ دیا ہے ان سب میں انفاق کرو ۔ کتنا انفاق کیا جائے ؟ اسی کا جواب ہے العفو ۔ یعنی جو فاضل از ضرورت ہو ۔ اگر "عفو" لے کر اس کی قیمت ادا کر دی جائے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی سے سَو روپے کی رقم زکات وصول کر کے اسے دو سَو روپے کا بکرا دے دیا جائے ۔ اس قسم کی سفسطہ آمیز منطق وہی لوگ پیش کر سکتے ہیں جو ابھی تک سرمایہ داری اور لا محدود ملکیت کو اسلام کا سب سے بڑا رکن تصوّر کیے ہوئے ہیں ۔ سیدنا عمر سلام اللہ علیہ کے قول پر غور کیجیے ۔ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ......

امیروں کے "فاضل اموال" کی قیمت ادا کر کے لے لیتا اور غریبوں میں تقسیم کر دیتا ! لینے کی یہ کون سی قسم ہے کہ ایک ہاتھ سے لے کر دوسرے ہاتھ سے واپس کر دو ؟

سب سے زیادہ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ یہ حضرات ہمیشہ سے یہ مطالبہ کرتے آتے ہیں کہ حکومت ہر فرد کی ضروریاتِ زندگی ـــــ مکان ، غذا ، دوا ، تعلیم وغیرہ ـــ کی ذمے دار ہے ۔ جان ، مال ، آبرو ، مذہب ، معبد وغیرہ کا تحفظ بھی حکومت ہی کے ذمے ہے ۔ مطالبہ بہت صحیح ہے لیکن اسی سانس میں یہ دعویٰ بھی فرماتے ہیں کہ لا محدود زمین ، لا محدود روپے ، لا محدود کشتیاں ، لا محدود کنیز و غلام وغیرہ رکھنا عین اسلام ہے اور اگر وہ زکات (سال میں چالیسواں یا غلّے کا دسواں بیسواں) ادا کر دے تو اس سے مزید کچھ لینا ظلم ہے اور خلافِ اسلام ہے ۔

سوال یہ ہے کہ کوئی حکومت ہر فرد کی تمام ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کہاں سے کرے گی ؟ آسمان سے تو روپے برس نہیں سکتے ، یہ سیدھی بات ہے کہ صاحبِ حیثیت لوگوں سے وصول کر کے ہی مستحقین پر تقسیم کرے گی ۔ اسی کو حضورؐ نے فرمایا ہے کہ :

Yes.

تؤخذ من اغنیاءھم وترد علی فقرائھم[1]

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ - مسلم کتاب الایمان - نسائی کتاب الزکوٰۃ - ابن ماجہ کتاب الزکوٰۃ - ابوداؤد - کتاب الزکوٰۃ - گویا صحاح ستہ کی متفق علیہ حدیث ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امیروں سے لیا جائے گا اور غریبوں کو دیا جائے گا۔

پس اگر دولت مند اپنے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھے رہیں اور ان سے کچھ نہ لیا جائے تو محتاجوں کی ضروریات کس طرح پوری ہوں گی؟ شاید یہ کہہ دیا جائے گا کہ زکات سے (جو ان کے خیال میں چالیسویں سے متجاوز نہیں ہو سکتی) سارے معاشی مسائل حل ہو جائیں گے۔ لیکن ہم ان کو یہ فرمانِ نبوی یاد دلانا چاہتے ہیں کہ:

ان فی المال لحقاً سوی الزکوٰۃ [1]

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حق ہے۔

جب یہ حق پورا نہ کیا جائے یا محض زکوٰۃ سے مقصد پورا نہ ہو تو حکومت مصالح عامہ کے لیے جس دولت یا زمین پر بلا معاوضہ قبضہ کرنا چاہے کر سکتی ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی ممانعت نہیں۔ اس کے لیے صحیح بخاری کی ایک طویل روایت پر غور کیجیے۔ پہلے یہ سن لیجیے کہ مدینے سے چند میل کے فاصلے پر ایک مقام ہے جسے "ربذہ" کہتے ہیں۔ یہ سرزمین دورِ جاہلیت اور عہدِ اسلامی میں بھی انصار کے قبضے میں تھی۔ سیدنا عمر سلام اللہ علیہ نے کوئی معاوضہ دیے بغیر قبضے میں لے لی۔ جن مصالح عامہ کے پیش نظر اس کو قبضے میں لیا وہ تھے فوجی گھوڑوں کے لیے اور عام غریبوں کے مویشی کے لیے چراگاہ بنانا۔ یہ زمین کتنی تھی اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ بقول امام مالکؒ یہاں چالیس ہزار گھوڑے چرتے تھے جو عوام کے مویشی کے علاوہ تھے۔ اب بخاری کی روایت ملاحظہ فرمائیے:

انّ عمر بن الخطاب استعمل مولیً لہ یُدعیٰ ھُنیاً علی الحمیٰ فقال یا ھُنییُّ اضمم جناحک علی المسلمین واتّقِ دعوۃ المظلوم فان دعوۃ المظلوم مستجابۃٌ وَاَدخِلْ رَبَّ الصُّرَیمۃ ورَبَّ الغُنَیمۃِ وایّایَ ونَعَمَ ابنِ عوفٍ ونعما بنِ عفان فانّھما ان تَھلِکْ مَاشِیَتُھُمَا یرجعانِ الی زرعٍ ونخلٍ وانّ ربَّ الصُّرَیمہ وربَّ الغُنَیمۃِ ان تَھلِکْ مَاشِیَتُھُمَا یَأتِنی بِبَنِیہِ فیقول یا امیر المومنین یا امیر المومنین افتارکھم انا لا ابا لک

---

[1] ترمذی کتاب الزکاۃ باب ما جاء ان فی المال حقا سوی الزکاۃ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فالماءُ والکلأ ایسۃ علیّ من الذھب والورق وایم اللہ انھم لیرون ان قد ظلمتھم انّھا لبلادھم قاتلوا علیھا فی الجاھلیۃ واسلموا علیھا فی الاسلام والذی نفسی بیدہٖ لولا المال الذی احمل علیہ فی سبیل اللہ ما حمیت علیہم من بلادھم شبراً۔

عمر بن خطابؓ نے چراگاہ کی نگرانی کے لیے اپنے ایک مولی کو مقرر فرمایا جس کو ہُنَیؓ کے نام سے پکارا جاتا تھا اس سے آپ نے فرمایا کہ: اے ہُنَیؓ مسلمانوں پر زیادتی کرنے سے اپنا ہاتھ روکے رکھو اور مظلوم کی فریاد سے بچتے رہو۔ کیونکہ مظلوم کی فریاد قبول ہوکر رہتی ہے۔ تھوڑے اونٹ یا بکری والوں کو اس چراگاہ میں آنے دو اور عبدالرحمان بن عوف اور عثمان بن عفان کے مویشی کو اس میں داخل ہونے سے روک دو۔ کیونکہ اگر ان کے مویشی ہلاک بھی ہو جائیں تو وہ کھیتی یا باغ کی طرف متوجہ ہو جائیں گے (اور اپنا کام چلالیں گے) لیکن تھوڑے اونٹ یا بکری والوں کے مویشی اگر ہلاک ہو گئے تو یہ اپنے خاندان کو لے کر آئیں گے۔ اور " اے امیرالمومنین! اے امیرالمومنین" کہہ کر فریاد کریں گے۔ تو کیا میں انھیں یوں ہی چھوڑ دوں؟ تجھ سے اے ہُنَی خدا سمجھے۔ اس وقت میرے لیے (ان کو) پانی اور چارہ مہیا کرنا دینار و درہم کا انتظام کرنے سے زیادہ سہل ہے۔ خدا کی قسم یہ لوگ (اہل ربذہ) خیال کریں گے کہ میں ان پر (ان کی زمین لے کر) ظلم کر رہا ہوں۔ بلاشبہ یہ سرزمین انہی لوگوں کی ہے جس کی خاطر وہ کفر میں بھی جنگ کرتے رہے اور اسی صورتِ حال میں وہ اسلام لائے۔ لیکن قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر یہ مال (گھوڑے) نہ ہوتے جن کی ذمہ داری جہاد فی سبیل اللہ کے لیے اٹھائے ہوئے ہوں تو میں ان کی سرزمین کے ایک بالشت حصے کو بھی چراگاہ نہ بناتا۔[1]

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ ربذے کا یہ علاقہ جن لوگوں کا تھا وہ جاہلیت میں بھی انہی کا تھا اور اسلام لانے کے بعد بھی عہد فاروقی تک مسلسل انہی کا رہا۔ لیکن فاروقِ اعظم نے اس وسیع علاقے کو "بحقِ سرکار" لے لینے میں کوئی تامل نہ کیا۔ لیا اور بلا معاوضہ لیا۔ کس کے لیے؟ اپنے لیے نہیں عوام کی حفاظت کرنے والے مجاہدین کے گھوڑوں کے لیے اور غریبوں کے اونٹوں اور بکریوں کے لیے۔ اور سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ زمین والوں کی طرف سے معاوضہ طلب کرنے کا کوئی ذکر تک نہیں۔

---

[1] بخاری جلد اول ص ۴۳۳ کتاب الجہاد باب اذا اسلم قوم فی دار الحرب ۔ ۔ ۔ الخ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج حیرت بالائے حیرت یہ ہے کہ "ناجائز املاک" کو ضبط کرنے کی "اجازت" دی جاتی ہے ذرا غور فرمائیے کہ یہ اسلام کی کونسی قسم ہوگی کہ مسلمان کہلانے والا ناجائز املاک کو اپنے پاس رکھے رہے۔ اس سے فائدہ اٹھاتا رہے اور اس وقت تک اس سے دستبردار نہ ہو جب تک حکومت اس سے چھین نہ لے بلکہ طرح طرح کے حیلے بہانے اور فتوے اسے جائز ثابت کرنے کے لیے پیش کرتا رہے۔ اور پھر یہ بتائیے کہ اسے ناجائز قرار دینے کا کیا معیار ہوگا؟ مال تو جمع کرنا ہی ناجائز ہے۔ اس جمع مال میں جائز و ناجائز کا فرق کرنا ایسا ہی ہے جیسے ہم آئے دن اخباروں میں پڑھا کرتے ہیں کہ فلاں جگہ "ناجائز شراب" پکڑی گئی۔ گویا کچھ شراب جائز ہوتی ہے اور کچھ ناجائز۔ جب شراب فی نفسہٖ ناجائز ہے تو اس میں جائز و ناجائز کی تفریق کیسی؟ ناجائز املاک کے متعلق تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ سوال تو صرف جائز و حلال املاک کو لینے کا ہو سکتا ہے جبکہ وہ زائد از ضرورت ہو۔ ربذہ کا علاقہ یا وادیِ عقیق، دونوں ہی جائز املاک تھے اور یہ دونوں سیدنا فاروقِ اعظم سلام اللہ علیہ نے مصالحِ امت کے لیے بلا معاوضہ لیے۔ وادیِ عقیق فردِ واحد سے اور ربذہ ایک قوم سے۔

اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی سن لیجیے جس سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ روپے پیسے کی شکل میں زیادہ سے زیادہ کتنی دولت "کنز" میں شمار ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ سے ایک ارشادِ نبویؐ یوں مروی ہے:

من ترك عشرة الاف درهم جعلت صفائح يعذب بها يوم القيمة۔[1]

جو شخص دس ہزار درہم چھوڑ کر مرے تو وہ دولت بروزِ حشر چوڑے چکلے پتھر بن جائیں گے جن سے اسے عذاب دیا جائے گا۔ (داغا جائے گا)۔

حکومتِ مصر نے عہدِ نبویؐ کے دس ہزار درہم کا اندازہ آج کے اسی ہزار روپے کے برابر کیا ہے اگر آج حکومتِ پاکستان اپنے اندازے کے مطابق ایک رقم معین کر کے اس سے زیادہ دولت جمع کرنے کو ممنوع کر دے تو اس حدیث کے منشا کے مطابق ہوگا۔ کنز و اکتناز کو ہر حال میں روکنا فریضۂ حکومت ہے۔ اور ایسے قوانین سے خود اربابِ حکومت بھی مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔

---

[1] احکام القرآن للجصاص ج ۳، ص ۱۲۲

© rasailojaraid.com